محمد جعفر پھلواروی

اسلام اور فطرت

عرصۂ دراز سے ہم آپ یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ "اسلام دینِ فطرت ہے"۔ مساجد کے منبروں سے، پنڈال کے اسٹیجوں پر اور کتابوں کے صفحات میں یہ دعویٰ بار بار دہرایا جاتا ہے کہ "دینِ اسلام عین فطرت کے مطابق ہے"۔ اس دعوے کی دلیل میں قرآن پاک کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا الخ — اللہ کی فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا ہے۔

وہ لوگ بڑے اچھے تھے جو بہت سے اسلامی حقائق کو غور و محض میں اترے بغیر مان کر اپنا ایمان صحیح سلامت لے گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم لوگوں کو جو دور ملا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ ایسے ایسے مسائل و مباحث سامنے آتے ہیں جو پہلے تصور میں بھی نہیں آتے تھے۔ ہر ہر مسئلے کی تدقیق و تحقیق ہوتی ہے نت نئی موشگافیاں ہوتی ہیں۔ ایک ایک پہلو کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اور ہر شے کو عقل، مشاہدے اور تجربے کی میزان پر تولا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "عشق" میں جہاں جہاں خلا پیدا ہوتا ہے اسے "عقل" سے پُر کیا جاتا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی عین تقاضائے فطرت ہے کیونکہ عقلِ انسانی کو تجربہ اور تجربے کو عقل ارتقا کی طرف لیے جا رہی ہے۔ اس وقت عقلِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ غائبانہ ایمان کو لباسِ مشاہدہ میں جلوہ گر دیکھنا چاہتی ہے اور تقلید جامد کی بجائے استدلال کو تلاش کرتی ہے۔

اس ارتقائی مگر پُرفتن دور میں جب ہمارے سامنے یہ دعویٰ آتا ہے کہ "اسلام دینِ فطرت ہے" تو ہر طرف سے عقل سوالات کی بوچھاڑ کرنے لگتی ہے اور اس دعوے کی دلیل مانگتی ہے اور ایک مسلمان کے لیے کشمکش پیدا کر دیتی ہے۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام فطرت کے مطابق نہیں جب بھی

مصیبت ہو اور اگر یہ کہیں کہ مطابقِ فطرت ہے جب بھی مصیبت ہے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ اسلام فطرت کے مطابق نہیں تو ہر شخص کہے گا کہ "پھر ایک غیر فطری چیز کی طرف کیوں بلاتے ہو؟" اور اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام فطرت کے عین مطابق ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "پھر تمام انسان غیر فطری دین کو چھوڑ کر اسے کیوں قبول نہیں کر لیتے؟" نیز یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسلامی احکام ہیں جن کو عین فطرت کے مطابق کہا جا سکے؟ خنزیر نہ کھاؤ۔ سود نہ لو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ حج کے لیے جاؤ۔ اور ایسے ایسے ہزاروں معاشرتی، سیاسی، اجتماعی، معیشتی، معاشی، اخلاقی احکام ہیں۔ کیا یہ سب فطرت کے مطابق ہیں؟ آخر ان کا فطرت سے کیا تعلق ہے؟ ہم کس طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ فی الواقع یہ تمام احکام فطرت کے عین مطابق ہیں جب کہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۹۹٪ طبائع کے اندر ان سے گریز موجود ہے اور بعض احکام کی تعمیل کرانے کے لیے جبر و اکراہ تک موجود ہے؟ بھوکے کو کھانا کھلانے کے لیے قانون یا سیاست کا کوئی دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ بھوکا ہے تو اس کی فطرت خود ہی اسے کھانے پر راغب کر دے گی۔ جبر کی ضرورت تو اس وقت ہو گی جب اسے بھوک نہ ہو اور فطرت اسے کھانے سے روکتی ہو۔

اس مرحلے پر پہنچ کر ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ آیتِ مذکورہ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا کا کیا مطلب ہے؟ اگر ہم پہلے "فطرت" کا صحیح مفہوم سمجھ لیں اور قرآن ہی کی مدد سے اسے سمجھیں تو امید ہے کہ اس آیت کا مطلب بھی واضح ہو جائے گا اور ان پیچیدگیوں کا حل بھی نکل آئے گا جو "اسلام عین دینِ فطرت ہے" کے دعوے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ دعویٰ تو ہم کر ہی نہیں سکتے کہ اسلام خلافِ فطرت ہے۔ دعویٰ بہرحال یہی صحیح ہے کہ اسلام عین فطرت ہے۔ اسی بنیاد پر ہم دعوتِ اسلام دینے کا حق رکھتے ہیں۔ نعوذ باللہ غیر فطری دین ہونے کی وجہ سے اسلام کو ہم نے نہ مانا ہے نہ اس سبب سے کسی کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں کئی باتوں پر غور کرنا ہو گا۔ مثلاً:

(۱) "فطرت" کے از روئے لغات و قرآن کیا معنی ہیں۔

(۲) فطرت ہے کیا چیز؟

(۳) انسانی فطرت کیا ہے؟

(۴) اسلام کس لحاظ سے دینِ فطرت ہے۔

(۵) اسلام کہاں کہاں فطرتِ کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

غرض اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جن کے جواب پر یہ سمجھنا منحصر ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے یا نہیں؟ ہم سب سے پہلے اس کی لغوی حیثیت پر بحث کریں گے۔ وباللہ التوفیق

مترادفات

عربی زبان میں فاطر، خالق، بارئ، مبدئ، بدیع، منشئ[1] سب کے معنی ہیں کسی شے کو (از سرِ نو) وجود میں لانے والا۔ یہ سب خدا کے صفات ہیں اور ان میں سے ہر ایک لفظ صنعتِ ایجاد و احداث کے کسی خاص پہلو کو ظاہر کرتا ہے یعنی پیدا کرنے کا مفہوم سب میں مشترک ہے لیکن ہر ایک لفظ نوعیت آفرینندگی اور کیفیتِ خلق کے کسی خاص پہلو کو واضح کرتا ہے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک لفظ سے بحث کرنی ہے اور وہ ہے فاطر۔ معنی اس کے بھی وہی ہیں جو اس کے دوسرے مترادف الفاظ کے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے معنی محض پیدا کرنے والا یا آفرینندہ نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں کسی شے کو ایک خاص فطرت پر پیدا کرنے والا ——— یہ لفظ انسان کے لیے بھی آیا ہے (الذی فطرکم اول مرۃ ۱۷/۵۲) اور ساری کائنات کے لیے بھی فاطر السموات والارض ۶/۶۱

مشترک مفہوم

اب یہ سوال ہے کہ "فطرت" کے کیا معنی ہیں اور اس سے کیا مراد ہے؟ لغوی معنی تو اس کے بہت سے ہیں لیکن ان سب میں ایک خاص مفہوم مشترک ہے۔ پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے۔

---

(۱) فاطر السموات والارض ۱۴/۱۵ خالق کل شیئ ۳۹/۶۲ ھو اللہ الخالق البارئ ۵۹/۲۵ وھو یبدئ الخلق ثم یعیدہ ۳۰/۲۷ بدیع السموات والارض ۲/۱۱۸ انشأھا اول مرۃ ۳۶/۸۰ -

ف، ط، ر) کا مادہ جہاں آئے گا وہاں کسی روک سے باہر آجانے (یا لانے) کا مفہوم پایا
مثلاً:

فطرہ: اسے شق کر دیا۔ یعنی کسی چیز کو اس طرح پھاڑ دیا کہ اندر کی چیز ظاہر ہو گئی۔
فطرت ناب البعیر: اونٹ کے دانت نکل آئے۔ یعنی مسوڑھوں کو چیر کر باہر ظاہر ہو گئے
فطرت الشاۃ: انگلیوں کے کناروں سے بکری کا دودھ دوہا۔ یعنی تھنوں سے باہر کر لیا۔
فطر الامر: اسے پیدا کیا یا شروع کیا۔ یعنی پردۂ عدم سے باہر لے آیا
فطر الصائم: روزہ کھول دیا۔ یعنی کھانے پینے کی بندش سے باہر آگیا۔

یہ مجردات کی مثالیں ہیں۔ کچھ مزید فیہ کی بھی سن لیجیے:

فطر الصائم: روزہ کھول دیا
فطّر الصائم: روزہ کھلوایا
} مطلب اوپر گزر چکا ہے۔

فطّر الشیٔ: پھاڑ دیا
تفطر الشیٔ والفطر: شق ہو گئی
} مطلب اوپر گزر چکا ہے

تفطّرت والفطرت الارض بالنبات: زمین نے شق ہو کر سوئی (نباتات کی) ظاہر کر دی۔
تفطّرت والفطرت القضیب: شاخ کے اندر سے شگوفے ظاہر ہونے لگے۔
} مطلب واضح ہے۔

افطر الشیٔ: ایجاد کیا۔ یعنی پردۂ خفا سے باہر لے آیا

کچھ اسمائے مشتقہ بھی ملاحظہ ہوں:

الفَطر: مصدر ہے بمعنی شق ہونا
الفِطر: انگور کا سرا جو ظاہر ہو گیا ہو
عید الفطر: وہ عید جو شوال کا نیا چاند ظاہر ہونے کے بعد آتی ہے۔

الفطر: وہ نباتات جو زمین کو شق کر کے ظاہر ہو گئی ہو (سانپ کی چھتری کو بھی کہتے ہیں جو ایک پودا ہے)

الفطیر: تازہ روٹی، تازہ دودھ۔

الأفطور: چہرے یا ناک کی پھٹن

الفاطر: جس کے دانت اندر سے نکل آئے ہوں۔

فطرت اور فاطر

دیکھیے ان تمام الفاظ میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ ہے کسی شے کا خفایا روک سے ظہور میں آجانا (یا لانا)۔ اب دو لفظوں پر غور کیجیے۔ ایک "فطرت" اور دوسرے "فاطر"۔۔۔۔۔ فطرت کے معنی لغت میں یہ ہیں:

(۱) الصنفة التی یتصف بھا کل موجود فی اول زمان خلقتہ وہ صفت جو موجودات میں ابتدائے آفرینش کے وقت سے پائی جائے۔

(۲) صفة الانسان الطبیعیة انسان کی طبیعی حالت

(۳) الدین قانونی نظام

(۴) السنة سیرت یا طریقہ

(۵) الابتداع والاختراع آفرینش نو

ان تمام معانی میں اصلی اور مرکزی معنی وہی ہیں جس کو ۱ میں لکھا گیا ہے۔ یعنی موجودات میں روز اول سے جو صفت موجود ہو اسی کو فطرت کہتے ہیں۔ باقی تمام معانی اسی ایک معنی کے مختلف پہلو ہیں۔

اقسامِ فطرت

اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس پوری کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی صفت سے وابستہ ہے اور وہ صفت ایسی ہے جو اس کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ یہ صفات کچھ تو ارادی ہوتی ہیں کچھ غیر ارادی۔ کچھ شعوری ہوتی ہیں کچھ غیر شعوری۔ پانی نشیب کی طرف جاتا ہے یہ پانی کی فطرت ہے مگر اس میں پانی کے اپنے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں بلکہ ایک "کونی فطرت" ہے۔

بکری گھاس کھاتی ہے یہ اس کی فطرت ہے لیکن اس میں بکری کے ارادے کو بھی دخل ہے۔

یہاں چند باتیں اور بھی ذہن نشین کر لیجیے

۱۔ کوئی شے کسی ایک ہی فطرت کی حامل نہیں۔ بلکہ اس کے اندر بہت سی فطرتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کی فطرت صرف یہی نہیں کہ وہ نیچے کی طرف بہہ جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اسے ایک خاص درجے کی ٹھنڈک ملے تو وہ جم جائے اور خاص درجے کی حرارت حاصل ہو تو بھاپ بن کر اُڑ جائے۔ بکری کی فطری صفت صرف گھاس کھانا ہی نہیں بلکہ یہ بھی اس کی فطرت ہے کہ چلے، پھرے، دوڑے، اچکے دشمن کو دیکھ کر مقابلہ کرے یا خوف زدہ ہو جائے۔ خاص اوقات میں جنسی میلان سے بے چین ہو جائے، غذا کے بعد جگالی کرے وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ایک نوع کے مختلف افراد میں تو فطرت کے تقاضے مشترک ہوتے ہیں لیکن دوسری نوع یا جنس میں انہی فطری تقاضوں کا یعینہٖ ہونا ضروری نہیں۔ کچھ فطرتیں مشترک ہوں گی اور کچھ مختلف۔ بکری، بندر اور بلی میں کچھ فطرتیں مشترک بھی ہیں اور کچھ مختلف بھی۔ بھوک، جنسی میلان، دھوڑ دھوپ، خوف یا مقابلے وغیرہ میں سب مشترک ہیں لیکن غذائی پسند وغیرہ جدا جدا ہیں۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ فطری صفات سب کی سب دوامی نہیں ہوتیں۔ بعض بدل بھی جاتی ہیں جسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ بعض فطرتوں کا بدلنا بھی فطرت میں داخل ہے۔ شیر اور بکری دونوں کے بچے پیدا ہوتے ہی دودھ پینے لگتے ہیں۔ یہاں دونوں کی فطرت میں یکسانی ہے لیکن پھر دونوں کی فطرت بدل جاتی ہے۔ ایک گھاس پر لگ جاتا ہے اور دوسرا گوشت پر۔ یہ تبدیلِ فطرت بھی داخلِ فطرت ہی ہے یعنی دودھ پینے کی طرح دودھ کا چھوٹنا بھی دونوں کی فطرت ہے اور پھر الگ الگ چیزوں پر لگ جانا بھی فطرت ہی ہے۔

غرض جوہر (مثلاً گیس)، جسم (مثلاً پتھر)، نامی (نباتات)، متحرک بالارادہ (حیوانات)، اور ناطق (انسان)، ان میں سے ہر طبقے کی مخلوق کی فطرتیں الگ الگ بھی ہیں اور کچھ باتیں باہم مشترک بھی ہیں۔ درجات کا تفاوت بھی ہے اور اس تفاوت کے باوجود سب کی فطرتوں میں کہیں کہیں توافق بھی ہے۔

فطرت کیا ہے؟

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد مختصر لفظوں میں فطرت کی یوں تعریف کی جا سکتی ہے کہ "جو اصولِ حیات یا قانون وجود جس سے وابستہ ہو وہی اس کی فطرت ہے۔ عام اس سے کہ وہ متبدل ہو یا غیر متبدل۔ ارادی ہو یا غیر ارادی۔ شعوری ہو یا غیر شعوری۔"

اس میں وہ معنی و مفہوم ہر نوع موجود ہے جو ہم ابھی ف، ط، ر کے بیان میں لکھ چکے ہیں یعنی کسی چیز کا ایک پوشیدگی یا روک سے باہر آجانا (یا سامنے آنا)۔ ہر شے کی فطرت وہ صفت ہے جو بیساختہ اس کی ذات سے باہر آجاتی ہے۔ کسی چیز کا وجود اس سے کسی صفت کا صدور ظہور و نمود ہیں۔ فطرت ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی شے میں بند ہوتی ہے اور جب موقع آتا ہے تو اس شے کے اندر سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

فاطر کا مطلب

فطرت کی حقیقت و مفہوم معلوم کرنے کے بعد فاطر کا مطلب بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ فقط اتنی ہی بات کو ظاہر نہیں کرتا کہ اللہ تعالےٰ صرف آفرینندہ اور خالق ہے بلکہ موجودات میں جس موجود کے ساتھ کوئی فطرت وابستہ ہے اس فطرت کا بھی آفرینندہ وہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں فاطر کے معنی ہوئے ہر شے کو اس کی مخصوص فطرت پر پیدا کرنے والا۔

فطرتِ انسانی کی تلاش

اب آئیے تلاش کریں کہ انسان کی فطرت کیا ہے اور اس کے اندر فاطرؔ نے کیا کیا فطری تقاضے رکھے ہیں؟ نیز وہ کون سے فطری مطالبات ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک یا باہم مختلف ہیں؟ یہ معلوم کر لینے کے بعد ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ اسلام کس لحاظ سے دینِ فطرت ہے۔

اہلِ مغرب اور فطرتِ انسانی

فطرت انسانی کیا ہے؟ اس بارے میں اہل مغرب کے کئی مدارس خیال ہیں اور سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض مفکرین کا یہ خیال ہے کہ اگر ایک انسان کو تمام موثر ماحول اور خارجی عوامل سے بالکل

الگ تھلگ رکھا جائے تو اس کے اندر جو خصوصیات از خود پیدا ہوں گی ان ہی خصوصیات کا نام ہے فطرتِ انسانی۔ فطرتِ انسانی کی یہ تعریف خوب صورت الفاظ سے زیادہ اور کسی ایسے معنی کی حامل نہیں جو شرمندۂ وجود ہو سکے۔ اسی کو کہتے ہیں تعلیق المحال بالمحال۔ اولاً تو ایسا ہونا ہی ناممکن ہے کہ کوئی انسان پیدا ہو کر تنہا پرورش پا جائے۔ اور فرض کیجیے کہ ایسا ہو بھی جائے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ جو انسان بھی اس طرح پل جائے اس کی خصوصیات بالکل ویسی ہی ہوں گی جیسی دوسرے اسی طرح کے پلے ہوئے انسان کی ہوگی؟ فرض کیجیے یہ بھی ممکن ہو جائے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کی زندگی کو باقی رکھنے والی غذائیں، آب و ہوا اور دوسرے عوامل ایسے ہر ایک انسان کے مزاج پر اثر انداز نہ ہوں؟ لہٰذا ایسی خصوصیات کا تعین ہی ناممکن ہے جن پر فطرتِ انسانی کے لفظ کا اطلاق ہو سکے۔ اور جب یہ ناممکن ہے تو یہ سوال ہی بے معنی ہو جاتا ہے کہ فلاں چیز فطرتِ انسانی کے مطابق ہے یا نہیں؟

بعض مفکرینِ مغرب کا یہ خیال ہے کہ سارے عالم کے ہر دور، ہر قوم اور ہر ملک کی انسانی تاریخ کا منصفانہ مطالعہ کرنے کے بعد جو جو باتیں سب میں مشترک معلوم ہوں وہی فطرتِ انسانی ہوں گی۔ یہ خیال بھی پہلے خیال کی طرح بے معنی ہے۔ اولاً تو انسانی تاریخ کا ایسا مکمل دفتر ملنا ہی ناممکن ہے۔ اور فرض کیجیے یہ ممکن بھی ہو جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس پر تبصرہ کرنے والا اور کسی نتیجے پر پہنچنے والا پوری دیانت اور غیر جانبداری سے کام لے گا یا سہو و خطا کے بغیر کسی صحیح نتیجے پر پہنچے گا؟ اور اگر اس طرح کے کئی مطالعہ کرنے والے انسان ہوں تو وہ اپنے رجحانات کے اختلافوں کو کس طرح دور کر سکیں گے؟ غرض فطرت کی یہ تعریف بھی ایسی کسوٹی ہے جس پر کسی حقیقت کو پرکھا نہیں جا سکتا۔

بعض دوسرے مفکرین کا یہ خیال ہے کہ انسان جب اپنی بالکل ابتدائی حالت میں بادیہ نشینوں کی زندگی بسر کرتا تھا بے لوث تھا اور بعد کی تہذیب و تمدن کی زندگی سے ناآشنا تھا اس وقت وہ اپنی اصلی انسانی فطرت پر تھا۔ گویا اس وقت وہ جو کچھ کرتا تھا عین فطرت کے مطابق ہی کرتا تھا۔ انسانی فطرت کی یہ نشان دہی بھی اول الذکر تعریفوں سے کچھ مختلف نہیں۔ جس دور کی زندگی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے وہ قبل از تاریخ کا دور ہے اس لیے اس کا کوئی صحیح علم نہیں ہو سکتا۔ ہاں موجودہ جنگلی

باشندوں سے اس کا قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جدا جدا ممالک کے وحشی انسانوں کی عادات بھی جدا جدا ہیں۔ ان سب کو ملا کر اگر کوئی مشترک قدر نکالی جا سکتی ہے تو وہ صرف جہالت و وحشت، آدم خوری، بے حیائی، اوہام پرستی وغیرہ کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جسے فطرتِ انسانی کا نام دیا جا سکے اور اس محک پر آئین و قوانین کو پرکھا جا سکے۔

بعض مفکرین نے نومولود بچوں کی عادات کو بھی فطرت انسانی قرار دیا ہے لیکن آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا یہ بھی صحیح نہیں۔ اگر بچوں کی حرکات و سکنات فطرتِ انسانی ہوتیں تو بڑوں کو ان پر ہنسنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

غرض فطرتِ انسانی کی صحیح تعریف کرنے میں بڑے بڑے مفکرین بھی کسی ناقابلِ انکار صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب یہی متعین نہ ہو سکے کہ فطرتِ انسانی ہے کیا چیز؟ تو ہم کسی چیز کو کیسے پرکھ سکیں گے کہ یہ فطرت کے مطابق ہے یا نہیں؟ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے اس حقیقت کو تلاش کیا جائے کہ فطرتِ انسانی سے کیا مراد ہے پھر یہ دیکھا جائے کہ اسلام کس لحاظ سے دینِ فطرت ہے؟

جہاں تک انسان کے فطری مقتضیات کا تعلق ہے دو چیزیں بہت نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ایک ہے حیوانی اور دوسری روحانی۔ اگر روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو الگ کر کے صرف حیوانی مطالبات پر نظر کی جائے تو انسان اور عام جانوروں میں کوئی خاص فرق بجز ذوق کے باقی نہیں رہتا۔ اور یہ ذوق اس سے زیادہ نہیں کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اور انسان ان ہی چیزوں کو ذرا تکلف سے پکا کر کھاتا ہے۔ بقائے حیات کے لیے کھانے پینے کا یا بقائے نسل کے لیے جنسی ذوق کا جہاں تک تعلق ہے اس میں بھی انسان اور جانور میں صرف ذوق ہی کا فرق ہے۔ دونوں میں خطِ امتیاز کھینچنے والی شے فقط اخلاقی اقدار یا روحانی کیفیات ہیں۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اسی نقطۂ نگاہ سے انسانی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اخلاقی اقدار

اب جب ہم انسان کی اخلاقی فطرت پر نظر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریباً ہر انسان میں

متضاد فطری صفات موجود ہیں۔ رحم و شقاوت، بخل و سخاوت، بزدلی و شجاعت، کمینگی و شرافت، حرص و قناعت، تاخیر و عجلت، سختی و نرمی، حیا و بے شرمی، سردی و گرمی، رضا و ناراضی، تحمل و غصہ، بغض و محبت غرض تمام متضاد اوصاف درجات کے تفاوت کے ساتھ ہر ایک انسان میں موجود ہیں اور یہ سب کچھ فطرت ہی کی بخششیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت کیا ہے؟ صفاتِ محمودہ یا صفاتِ رذیلہ؟ رحم یا شقاوت؟ حرص یا قناعت؟ عناد یا محبت؟ شکر یا ناشکری؟ عدل یا ظلم؟ وھلم جراً۔

قرآن اور انسان کے فطری رذائل

قرآن پاک انسان کی صفاتِ رذیلہ کو بھی عین فطرت بتاتا ہے مثلاً:

(۱) وکان الانسان قتورا ۱۷ : ۱۰۰ یعنی انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔

(۲) اذا مسہ الخیر منوعا ۷۰ : ۲۱ جب اس کے پاس دولت ہو تو بخل کرنے لگتا ہے۔

(۳) وتحبون المال حبا جما ۸۹ : ۲۰ تمہیں مال سے بے انتہا محبت و شغف ہے۔

(۴) وانہ لحب الخیر لشدید ۱۰۰ : ۸ انسان مال کی محبت میں بہت پختہ ہوتا ہے۔

(۵) یقول اھلکت مالا لبدا ۹۰ : ۶ کہتا ہے کہ میں نے اتنا مال اڑا دیا ہے۔

(۶) کلا ان الانسان لیطغیٰ ۰ ان رآہ استغنیٰ ۷۰ : ۱۹ : ۲۰ انسان حدِ اعتدال سے بھی گزر جاتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے۔

(۷) ان الانسان خلق ھلوعا ۰ اذا مسہ الشر جزوعا ۷۰ : ۱۹ : ۲۰ انسان اوچھا پیدا کیا گیا ہے۔ جب مصیبت آتی ہے تو بہت واویلا کرنے لگتا ہے۔

(۸) ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا ۱۷ : ۱۱-۸ انسان خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے کر بلاتا ہے۔ اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔

(۹) خلق الانسان من عجل ۲۱ : ۳۷ انسان جلد بازی کے خمیر سے بنایا گیا ہے۔

(۱۰) ..... فاذا ھو خصیم مبین ۱۶ : ۴ نمایاں طور پر جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

(۱۱) وکان الانسان اکثر شی جدلا ۱۸ : ۵۴ - انسان ساری مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

(۱۲) ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعنٰھا منہ انہ لیؤس کفور ۱۱ : ۹ - جب ہم انسان پر اپنا کوئی فضل کر کے اپنا فضل واپس لے لیں تو بڑی مایوسی اور ناشکری کا اظہار کرتا ہے۔

(۱۳) واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبہ واذا مسہ الشر کان یؤسا ۱۷ : ۸۳ جب ہم انسان پر اپنا کوئی انعام کرتے ہیں تو شکر کی بجائے الٹی بے رخی اور پہلوتہی کرتا ہے اور جب مصیبت آئے تو آس توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

(۱۴) واذا اذقنا الناس رحمۃ فرحوا بھا وان تصبھم سیئۃ بما قدمت ایدیھم اذا ھم یقنطون ۳۰ : ۳۶ - جب ہم لوگوں پر اپنا فضل فرماتے ہیں تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور اگر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے کوئی آفت نازل ہو تو نا امید ہو جاتے ہیں۔

(۱۵) لا یسئم الانسان من دعاء الخیر وان مسہ الشر فیؤس قنوط ۴۱ : ۴۹ - بہتری کی دعا سے تو انسان کو اکتاہٹ نہیں ہوتی لیکن جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو دل شکستہ اور ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

(۱۶) واذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ ۱۰ : ۱۲ - جب انسان پر مصیبت آتی ہے تو وہ ہمیں بڑے بڑے بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے ہر طرح پکارتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے کہ گویا اس نے مصیبت کے وقت ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔

(۱۷) ان الانسان لظلوم کفار ۱۴ : ۳۴ - انسان بڑا ہی ظالم اور ناشکرا واقع ہوا ہے۔

(۱۸) ان الانسان لکفور ۲۲ : ۶۶ - وکان الانسان کفورا ۱۷ : ۶۷ - انسان سخت ناشکرا ہے۔

(۱۹) واذا انعمنا ..... واذا مسہ الشر فذو دعاء عریض ۴۱ : ۵۱ - حالت تنعم میں انسان بے رخی برتتا ہے اور مصیبت میں لمبی چوڑی دعائیں کرنے پر اتر آتا ہے۔

(۲۰) فاما الانسان اذا ما ابتلٰہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن ٥ واما اذا ما ابتلٰہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن ٥ ۸۹ : ۱۵ -

جب اللہ تعالیٰ انسان کو اکرام و انعام سے نواز کر امتحان لیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ اللہ نے بڑا فضل کیا۔ لیکن جب روزی تنگ کر کے آزماتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلت میں ڈال دیا ہے۔

(۲۱) ان الانسان لربہ لکنود ۱۴:۹۱ - انسان اپنے رب کا انتہائی ناشکر گزار ہے۔

(۲۲) بل یرید الانسان لیفجر امامہ ۷۵:۵ انسان آئندہ بھی فجور ہی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

(۲۳) واحضرت الانفس الشح ۴ : ۱۲۸ - انسان کی فطرت میں بخل و حرص ہے۔

(۲۴) انہ کان ظلوماً جھولا ۳۳:۷۲ - انسان بڑا ہی ظالم و ناداں ہے۔

(۲۵) انہ لفرح فخور ٥ ۱۱:۱۰ - انسان بڑا اکڑنے والا شیخی باز ہے۔

ان تمام آیات کو دیکھیے۔ انسان کو جبلی اور فطری طور پر تنگ دل، بخیل، حریص، طاغی، سیر نہ ہونے والا، چیخ پکار کرنے والا، جلد باز، جھگڑالو، ناشکرا، یاس پسند، خدا فراموش، ظالم، خودغرض و بے وفا، وغیرہ وغیرہ بتایا گیا ہے۔ ایک چیز اور بھی دیکھتے جائیے۔ ایک طرف ارشاد ہے خلق من ماء دافق ۸۶ : ۶ یعنی انسان اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ ارشاد ہے کہ خلق الانسان من عجل ۲۱ : ۳۵ یعنی انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھیے تو صاف معلوم ہوگا کہ کوئی قانون خَلق کی طرح یہ فطرتیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ گویا خَلق اور خُلق دونوں میں مظاہر فطرت ہیں۔

ایک مشکل

غرض ایسی بہت سی آیات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفاتِ رذیلہ بھی فطرتِ انسانی ہی کے اندر موجود ہیں۔ دوسری طرف ارشادِ نبوی ہے کہ ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ - ہر نومولود فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی فطرت وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ وہ جلد باز

عجیل و حریص، ناشکرا، نادان و ظالم وغیرہ ہے؟ کیا بچہ اسی فطرت پر پیدا نہیں ہوتا؟ پھر کیا یہی وہ فطرت ہے جس کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ بچہ "فطرت" پر پیدا ہوتا ہے؟ اور کیا یہی ہے اسلام اور دین فطرت؟

ویسے بھی آپ دیکھیے تو ہر بچہ دوسرے کی چیز کو زبردستی چھین لینا چاہتا ہے۔ نہ ملے تو روتا اور مچلتا ہے ضد کرتا ہے، زمین میں لوٹتا ہے۔ یہ اس کی عین فطرت ہے۔ بعض اوقات بچہ یہ بھی کرتا ہے کہ کسی دوسرے بچے کو اپنی چیز بڑی فیاضی سے دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کی فطرت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہے دراصل وہ "فطرت" جس پر وہ بچہ پیدا ہوا ہے؟ سلب و نہب یا جود و سخا؟

پھر بڑوں اور عقل والوں کو بھی دیکھیے۔ وہ بھی فطری تقاضوں کے اس تناقض و تعارض میں بچوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ایک شخص فیاض ہے اور اپنے انجام کو سوچے بغیر دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے اور دوسرا ایک ایک پیسے پر جان دیتا ہے اور دوسروں کو لوٹنے کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا۔ وہ بھی فطرت ہے اور یہ بھی فطرت ہے۔ اور دونوں ہی متضاد فطرتوں پر پیدا ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دونوں فطرتیں فطرتِ اسلام ہیں؟ دلیل کہتی "ہاں" اور ذوق کہتا ہے "نہیں"۔

حل مشکل

آیئے اس مشکل کا حل تلاش کریں۔ بات کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں۔ معاملہ یوں ہے کہ فطرت وہ تمام جذبات ہیں جو انسان لے کر آیا ہے۔ ان جذبات کو نیست و نابود کرنا اگر مقصد ہوتا تو وہ دیئے ہی کیوں جاتے؟ خدا خود بظاہر متضاد صفات کا مالک ہے اور انسان کو اپنی ان ہی متضاد صفات کا مظہر بنایا ہے۔ خدا کسی انسانی صفت کو فنا کرنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف دو چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے (۱) صحیح محل اور (۲) توازن یا عدل۔ گویا خدا اپنے بندوں سے کہتا ہے کہ تم اپنی ہر فطرت کو اسی طرح صحیح محل پر اور عدل کے ساتھ استعمال کرو جس طرح ہم (خدا) کرتے ہیں۔ خدا کا بندوں سے یہ مطالبہ بھی عین تقاضائے فطرت ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

عدل

آگے چلنے سے پہلے دو ایک ضروری باتیں ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ خدائے تعالیٰ کی تمام صفات کو

اگر ہم سمیٹنا چاہیں تو تین لفظوں میں سمیٹ سکتے ہیں۔ رحمت، ربوبیت (آفاقی) اور عدل۔ کائنات کے ایک ایک ذرے میں یہی صفتیں کارفرما نظر آئیں گی۔ اور انہی کو سورۂ فاتحہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ رب العالمین۔ رحمٰن و رحیم۔ مالک یوم الدین۔ باقی تمام صفات الٰہیہ ان ہی صفات کے مختلف پہلوؤں کے مظاہر ہیں ہم اول الذکر دو چیزوں پر بحث نہیں کریں گے۔ اس وقت تیسری چیز یعنی "عدل" پر گفتگو کریں گے۔ یہ ایسی صفت ہے جو پورے نظام کائنات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور انسانی نظامِ حیات کا صحیح قیام اسی عدل پر موقوف ہے۔ اس کی ضد ہے ظلم جس کے معنی ہیں کسی چیز کا غیر محل پر استعمال۔ اگر مصرف صحیح ہو اور اس میں اعتدال و توازن نہ ہو تو وہ بھی خلافِ عدل یعنی ظلم ہوگا۔ اسی لیے ہم نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محلِ صحیح اور اعتدال صحیح۔ اسی نقطۂ نظر سے پوری کائنات کو دیکھنا ہے، اور اسی اصول سے ان تمام جذبات کو استعمال کرنا ہے جن کو ہم عین فطرت یا اس کا عطیہ کہتے ہیں۔

انسان کے اندر نرمی بھی ہے اور سختی بھی۔ خدا یہ نہیں کہتا کہ ان میں سے کسی جذبے کو انسان فنا کر دے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اولاً تو ان دونوں متضاد جذبوں کو صحیح محل پر استعمال کرو، دوسرے ان کا استعمال اعتدال کے اندر ہو۔ جہاں نرمی کا موقع ہو وہاں نرمی ہی ضروری ہے۔ سختی وہاں بے محل ہوگی اس لیے اسے ظلم کہا جائے گا۔ اور اسی طرح سختی کے موقعے پر سختی ہی کی جائے گی۔ وہاں نرمی کا شمار ظلم میں ہوگا۔ یہ تو ہوا محل۔ لیکن عین نرمی کے موقعے پر اتنی نرمی کی جائے جو ضرورت سے کم یا زیادہ ہو تو وہ صحیح محل پر ہونے کے باوجود اس لیے غلط ہوگا کہ اس نرمی میں توازن و اعتدال باقی نہیں رہا۔

ایک ضروری بات

توازن و اعتدال دراصل تنہا ایک وصف میں نہیں ہوتا بلکہ دو مختلف یا متضاد چیزوں میں ہوتا ہے۔ توازن یا اعتدال سے مقصد ہے دو مختلف یا متضاد چیزوں کا صحیح اور متناسب امتزاج۔ گویا نرمی و سختی ایسے دو وصف ہیں جن کو ہر موقعے پر متحد ہونا چاہیے لیکن متناسب امتزاج کے ساتھ۔ اس لیے نرمی کا مطلب اس کا علیحدہ و مجرد وجود نہیں بلکہ اس سے مراد ایسے طرزِ عمل کا مظاہرہ ہے جو سختی سے الگ نہ ہو بلکہ سختی پر صرف غالب آجائے۔ اسی طرح سختی سے مراد نری سختی نہیں بلکہ ایسی سختی ہے جس کی

تہ میں نرمی چھپی ہوئی ہو۔

فطرۃ اللہ

یہی ہے "فطرۃ اللہ" اور اسی اصول پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ جہاں کائنات کا ہر ذرہ ایک خاص فطرت رکھتا ہے وہاں خود خالق کائنات کی بھی ایک فطرت ہے جسے قرآن پاک اکثر "سنت اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ خدا کی فطرت، فطرت کلی ہے، لامحدود ہے اور اس کا کلی ادراک بھی ناممکن ہے۔ لیکن انسانی عقل جہاں تک سمجھ سکتی ہے آپ کو پوری کائنات میں ایک خاص فطرت کارفرما نظر آئے گی جو فطرت اللہ ہے۔ اس فطرت میں وہی محل صحیح اور وہی توازن و تناسب دکھائی دے گا۔ اسی فطرۃ اللہ کی وجہ سے پوری کائنات کی حیات و وجود اور بقا ہے۔ اسے سمجھ لینے کے بعد یہ حقیقت خود بخود روشن ہو جاتی ہے کہ انسان کو فی الواقع فطرۃ اللہ ہی پر پیدا کیا گیا ہے۔

پانی کو دیکھیے یہ دو اجزا سے مرکب ہے۔ ایک حصہ آکسیجن اور دو حصے ہائیڈروجن ہے (یہ تناسب باعتبار حجم یا جسامت کے ہے۔ باعتبار وزن کے تناسب الٹا اور الگ ہے یعنی ایک حصہ ہائیڈروجن ہے اور آٹھ حصے آکسیجن)۔ اس تناسب سے جب یہ دو گیسیں آپس میں ملتی ہیں تو اسے کہتے ہیں پانی جو سبب ہے بقائے حیات کا۔ وجعلنا من الماء کل شیء حی (ہر زندہ چیز ہم نے پانی سے بنائی ہے) لیکن اسی تناسب میں اگر بال برابر فرق آجائے تو وہ کیا ہوتا ہے؟ سم قاتل۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہی اعتدال پانی کے وجود کو اور بواسطۂ آب، کائنات کی ہر ذی روح کی حیات کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ذرا فرق آجائے تو وہی سبب زندگی، باعث موت بن جائے۔

انسان پر نظر ڈالیے۔ یہ مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔ بے پانی ہے باقی لوہا، چونا، کاربن اللہ خدا جانے کیا کیا ہے۔ لیکن سب کچھ ایک مخصوص تناسب کے ساتھ ہے۔ پھر مادیت سے گزر کر لطافت کی دنیا کو دیکھیے تو اسی انسان کے اندر خاص تناسب کے ساتھ حرارت بھی ہے اور برودت بھی، رطوبت بھی ہے اور یبوست بھی۔ ترشی بھی، تلخی بھی اور مٹھاس بھی۔ ان تناسبات اور توازن امتزاج میں کچھ بھی فرق آجائے تو اس کا دوسرا نام مرض ہوتا ہے یا موت۔ اس سے بھی زیادہ لطیف عناصر انسانی

کو دیکھیے تو ایک ہی انسان کے مزاج اور دل و دماغ کی کیفیات اور خیالات بیسیوں اجزا کا مجموعہ ہوتے ہیں اور وہی اس کے اخلاق کی بنیاد ہوتے ہیں۔ یہاں ان اخلاقی صفات کے امتزاجی تناسب و توازن میں جب بھی فرق پیدا ہوگا تو اخلاقی مرض پیدا ہوگا یا اخلاقی موت ظاہر ہوگی۔

بس یہی ہے وہ صحیح محل پر اور صحیح امتزاج کے ساتھ فطری تقاضوں کو پورا کرنا جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کرتا ہے لیکن ایک ضروری نکتہ بھی اس سلسلے میں ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ فطری مقتضیات کے صحیح استعمال کا یہ مطالبہ بھی عین فطرت کے مطابق ہے۔ یہ کوئی غیر فطری مطالبہ نہیں۔

استعمال صحیح کا فطری مطالبہ

انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ مختلف چیزوں کا استعمال صحیح تر ہو اور ان کا امتزاج معقول تناسب سے ہو اور اعتدال قائم رہے۔ وہ ہانڈی تیار کرتا ہے لیکن نمک، مرچ، گھی، مسالہ، گوشت سبزی سب کچھ ایک خاص تناسب سے ڈالتا ہے۔ وہ آگ اور پانی دونوں کو ایک ساتھ جمع کرتا ہے لیکن ایسی حکمت سے کہ پانی آگ کو بجھا نہ دے اور آگ پانی کو فنا نہ کر دے۔ اگر آگ پر پانی ڈال دے جب بھی صحیح نتیجہ نہ نکلے گا کیونکہ محل استعمال صحیح نہیں اور گوشت کے ہموزن نمک ڈال دے جب بھی غلط نتیجہ نکلے گا کیونکہ تناسب امتزاج درست نہیں۔ یہی انسان سردی میں آگ تاپتا ہے لیکن اپنے اور انگیٹھی کے درمیان ایک تناسب فاصلہ رکھتا ہے۔ نہ اتنی دور کہ سینک ہی نہ پہنچ سکے اور نہ اس قدر قریب کہ حرارت ناقابل برداشت ہو جائے۔ یہاں بھی وہ ایک حکیمانہ نقطۂ اعتدال تجویز کر لیتا ہے۔ پھر دیکھیے وہی انسان روٹی سے بدن نہیں ڈھانکتا اور کپڑے کو غذا نہیں بناتا کیونکہ یہ استعمال بے محل ہے غیر حکیمانہ ہے۔

غرض اشیا کا صحیح استعمال اور تناسب و توازن کا صحیح امتزاج (یعنی اعتدال) بھی انسانی فطرت ہی میں ہے جس کا ہر روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ بس کسر صرف اتنی ہوتی ہے کہ اپنی مخصوص دنیا سے ذرا باہر وہ اس صحیح استعمال اور حکیمانہ اعتدال کو اکثر فراموش کر جاتا ہے۔ جب دوسروں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے اس

وقت اخلاقی نقطۂ نظر سے اپنے فطری جذبات میں نہ صحیح توازن قائم رکھتا ہے نہ کسی فطری جذبے کا صحیح استعمال کرتا ہے حالانکہ جیسا کہ ابھی بتایا گیا کہ فطرت ہی کا تقاضا ہے صحیح استعمال اور حکیمانہ اعتدال۔

تفسیر آیت

اب فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا الخ کا مطلب بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ تم خدا کی اس فطرت کو اختیار کرو جس (فطرت) پر انسان کو پیدا کیا ہے۔ فطرۃ اللّٰہ کے لفظ پر پھر غور کیجیے۔ فطرت اللّٰہ کا ایک مطلب تو اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی اللّٰہ تعالیٰ کی ایک اپنی کلی فطرت بھی ہے جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ پوری کائنات کی آفرینش میں عدل، توازن، صحیح محل، متناسب اور حکیمانہ امتزاج اجزا نظر آتا ہے۔ پس انسان کو بھی اپنے پورے نظامِ زندگی میں یہی "اصول عدل و تناسب" قائم رکھنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اپنی فطرت کو الٰہی فطرت سے ہم آہنگ کر دینا چاہیے کیونکہ انسان خود بھی صفاتِ الٰہیہ کا مظہر ہے۔ اگر یہ ہم آہنگی نہ ہو گی تو ہر فطری جذبے کا استعمال یا مختلف فطری جذبات کا امتزاجی توازن غلط ہو جائے گا جس کا نتیجہ بجز فساد کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ دوسرے معنی فطرت اللّٰہ کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا کی بخشی ہوئی اس فطرت کو اختیار کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے یعنی جو "اصل فطرت" تمھیں خدا نے بخشی ہے (جو تمام انسانوں میں مشترک ہے اور تمام مواقع پر ہر روز اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اسی فطرت کے سانچے میں اپنی پوری زندگی کو ڈھال لو۔ یہ فطرت کیا ہے؟ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ صحیح استعمال اور حکیمانہ اعتدال کی عام روش جو ہر انسان میں فطرۃً موجود ہے۔ اسی فطرت کو پوری زندگی پر پھیلا دینا اس آیت کا مطالبہ ہے۔ دونوں معنوں میں تھوڑا اور باریک فرق ہے لیکن نتیجے کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں۔

آیت کا اگلا ٹکڑا یہ ہے لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون ٥ یعنی خدا کے قانونِ تخلیق میں کوئی تغیر و تبدل نہیں لیکن بیشتر لوگ اسے سمجھتے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے قانونِ تخلیق میں دو چیزیں ہیں عدل و تناسب دوسرے اس کا نتیجہ۔ جس قانونِ خلق کا جس جگہ جو نتیجہ نکلتا ہے وہ غیر متبدل حقیقت ہوتا ہے۔ یعنی سبب اور نتیجے اور علت و معلول کا جو قدرتی قانون کائنات

میں کارفرما ہے وہ اٹل اصول کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں ردوبدل نہیں۔ پس اسے بھی ایک غیر متبدل اصول سمجھنا چاہیے کہ اگر تمہاری اختیاری زندگی" قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوگی تو وہی نتیجہ نکلے گا جو "کونی زندگی" میں اصول فطرت کے خلاف چلنے سے نکلتا ہے۔ ہانڈی میں شکر ڈالنے سے سالن نمکین نہیں ہوگا، زیادہ نمک ڈالنے سے کڑواہٹ ضرور آجائے گی۔ بدن میں زیادہ حرارت پہنچانے سے بخار یا سرسام قطعاً ہوگا۔ یہ سب فطری قوانین ہیں۔ اسی طرح اخلاقی زندگی میں کسی فطری جذبے کا غلط استعمال یا مختلف جذبات کا عدم توازن نظامِ حیات کو بگاڑ دے گا اور یہ بھی عین فطری ہی قانون ہے۔

"دین قیم" کا مقصد بھی بس اسی قدر ہے کہ ہر جگہ فطری اصول کارفرما ہو۔ تمہاری انسانی زندگی کا نقشہ فطرۃ اللہ کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اُسی فطرۃ اللہ کے سانچے میں جو خود تمہارے اندر بھی موجود ہے۔

ایک بڑے مغالطے کا ازالہ

ابھی تک یہ بحث تشنہ ہے کہ انسانی فطرت ہے کیا؟ کچھ تو ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ انسان کے اندر جو بھی جذبہ موجود ہے وہ فطری ہی ہے۔ خدا کسی فطری جذبے کو فنا کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر جذبے کا محل استعمال صحیح تلاش کرے اور مختلف یا متضاد جذبات میں ایسا توازن و تناسب اور ایسا حکیمانہ اعتدال پیدا کرے کہ وہ تناقض و تعارض عین توافق و تعاون میں تبدیل ہو جائے۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی چیز کو لینے کی کوشش بچے کی فطرت میں ہے۔ چوری بھی چور کی فطرت ہے چغل خوری چغل خور کی اور بے جا سختی ظالم کی فطرت ہے۔ غرض بے شمار برائیاں ہیں جو بُروں کی عادت ہی نہیں بلکہ فطرت ہوتی ہے یا بن جاتی ہے۔ پھر کیا اس انسانی فطرت سے بُروں کی اخلاقی زندگی کو ہم آہنگ ہونا چاہیے؟ اور کیا اس طرح اس آیت کا منشا نعوذ باللہ پورا ہو جائے گا؟

دراصل یہ شبہ ایک مغالطہ ہے کیونکہ دراصل ہم فطرت کے ایک ہی رخ کو دیکھ رہے ہیں جو ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اس کا ایک اور رخ بھی ہے جو اسی فطرت کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ فرض کر لیجیے کہ چور ماں کے پیٹ سے ہی چور پیدا ہوا ہے اور چوری اس کی فطرت میں موجود ہے کہ نہ کسی وعظ

سے چھوٹ سکتی ہے نہ کسی سزا سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی بعض ایسے چوروں کا سراغ ملتا ہے جسے پے در پے چوریوں کی سزا دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹنے کی شکل میں ملی۔ حضورؐ کا وعظ اور سزا کچھ بھی موثر نہ ہو سکا اور اس لیے پھر پانچویں بار چوری کی اور موت کی سزا پائی)۔ بہ ظاہر اسے دیکھ کر یہی کہا جائے گا کہ وہ مادر زاد چور تھا اور اسی فطرت پر پیدا ہوا تھا۔ فرض کیجیے وہ اس چوری کو کوئی بُرا کام بھی نہیں سمجھتا تھا بلکہ نیکی سمجھ کر کرتا رہا ہو لیکن اسی چور کے گھر اگر دوسرا شخص چوری کرے تو پھر دیکھیے وہ کیسی صلواتیں سناتا ہے اور اس چور کا کس طرح تعاقب کرتا ہے۔ اس سے کہیے کہ بھئی "جو نیک کام" تم کر رہے تھے وہی دوسرے نے کیا لہٰذا اسے دعائیں دو۔ لیکن وہ مسلسل کوستا ہی جائے گا۔ آخر یہ کیوں؟ یہ وہی دبی ہوئی اصل فطرتِ انسانی ہے جو بے ساختہ اندر سے پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ چور کو گالیاں نہیں دیتا بلکہ چوری کے فعل شنیع پر ملامت کرتا ہے (جو اس کے اندر خود بھی موجود ہے)۔ یہی اصل فطرت ہے مگر خود چوری کرتے وقت (یعنی دوسروں سے معاملہ کرتے وقت) وہ اسے فراموش کر گیا تھا۔ جب خود اس کے ہاں چوری ہوئی تو فطرت اندر سے پھوٹ پڑی۔ "فطرت" کے لفظی معنی پر غور کیجیے جو ہم شروع میں لکھ آئے ہیں۔ اندر کی روک یا پردۂ خفا سے باہر نکل پڑنا اس لفظ کی ساخت میں موجود ہے۔

اسی پر آپ تمام فطری جذبوں کو قیاس کر لیجیے۔ بے سمجھ بچہ یقیناً دوسرے بچے کا کھلونا چھین لینے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اس کی فطرت معلوم ہوتی ہے لیکن اگر دوسرا بچہ خود اس سے کوئی چیز چھین لے تو اس کی اصل فطرت فوراً بیدار ہو جاتی ہے اور وہ ہر ممکن طریقے سے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اصلی اور دبی ہوئی فطرت اندر سے پھوٹ پڑی ہے۔ یہی اصل فطرتِ انسانی ہے جو خراب ماحول یا بے عقلی یا غلط تربیت کی وجہ سے دبی رہتی ہے۔ ہم بچے کے صرف ایک (چھین لینے کے) جذبے کو کیوں فطرت قرار دیں؟ اس حرکت پر (اگر دوسرا کرے) اس کے احتجاج کو بھی کیوں نہ فطرت کہیں؟

آپ اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بچہ لینے اور دینے کے فطری جذبوں کا استعمال صحیح محل پر نہیں کرتا۔ اس کی تشریح آگے بھی آئے گی۔

فطرت کے دو پہلو

گویا فطرتِ انسانی خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک فطرت سقیمہ دوسرے فطرتِ سلیمہ۔ فطرتِ سقیمہ بھی انسان کے اندر ہی سے ابھرتی ہے لیکن وہ نتیجہ ہوتی ہے بے عقلی، خراب ماحول یا غلط رہنمائی کا۔ اور فطرتِ سلیمہ بھی انسان کے اندر ہی سے ابھرتی ہے لیکن وہ ایک ایسی سادہ، نکھری، صاف و شفاف اور بے داغ فطرت ہوتی ہے کہ اگر بے عقلی، بُرے ماحول اور غلط تربیت وغیرہ سے متاثر نہ ہو تو ہمیشہ قائم رہتی ہے اور اگر ان تہوں میں دب جائے تو کسی وقت بے ساختہ اندر سے پھوٹ پڑتی ہے۔ اگر یہ اس قدر دب جائے کہ کبھی ابھر ہی نہ سکے تو وہ ختم اللہ علی قلوبھم الخ والا مقام ہوتا ہے، ورنہ فطرتِ سلیمہ تو ہر انسان میں ہوتی ہے اور وہ دبتی اور ابھرتی رہتی ہے۔

قرآنی اشارے

ان دونوں فطرتوں کو قرآن نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کیا ہے مثلاً

بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ — اپنی نیکی و بدی کو انسان خود بھی سمجھتا ہے۔

فالھمہا فجورھا وتقوٰھا — ہر انسان کے اندر فجور اور تقوے کی تمیز کی استعداد رکھ دی ہے۔

علاوہ ازیں آیت زیر بحث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر کی آیت یہ ہے:

بل اتبع الذین ظلموا اھواءھم بغیر علم ۔ فمن یھدی من اضل اللہ ۔ وما لھم من نصرین ۵ — یعنی ظالم تو اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں بے علمی کی وجہ سے۔ پھر جسے خدا گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔ اور ان کے لیے یہ روشِ زندگی کچھ مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔

اس کے بعد ہی یہ آیت ہے کہ فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا ۔ لا تبدیل لخلق اللہ ۔ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۵ لہذا یکسو ہو کر اپنی توجہ الدین پر مرتکز کر دو یعنی اس فطرۃ اللہ کو اختیار کرو جس پر انسان کو اس نے خلق کیا ہے قانونِ خلق میں کوئی گنجائشِ ترمیم نہیں۔ دین قیم یہی ہے لیکن بہت سے لوگ اسے سمجھتے نہیں۔

دونوں آیتوں میں دو متضاد روشِ زندگی کا بیان ہے۔ ایک راستہ ہے اتباع ہوٰی یعنی اپنی انسانی خواہشوں کی پیروی اور دوسری راہ ہے دینِ فطرت کی پابندی۔ فطرتیں دونوں ہی ہیں لیکن ایک ہے فطرتِ سقیمہ اور دوسری فطرتِ سلیمہ۔ پہلی فطرت نتیجہ ہے بے علمی کا (بغیر علم) اور دوسری فطرت ثمرہ ہے اس علم صحیح کا جو فطرتِ انسانی کو فطرتِ کونیہ یا فطرتِ الٰہیہ سے ہم آہنگ کر دے۔

تذکیر قرآنی

قرآن پاک خود اپنے آپ کو ذکری، ذکرہ، تذکرہ کہتا ہے۔ رسولؐ کو بھی تذکیر کا حکم دیتا ہے اور اسے مذکر کہتا ہے۔ تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ یاد وہاں دلائی جاتی ہے جہاں فراموشی یا غفلت کا پردہ پڑا ہو۔ یہ لفظ تذکیر خود اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ کوئی بھولی ہوئی یا پردۂ تغافل میں چھپی ہوئی چیز ہے جسے قرآن سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ بھولی ہوئی کیا چیز ہے؟ وہی فطرتِ سلیمہ جو فطرتِ سقیمہ کے پردوں میں چھپی اور اس کی تہوں میں دبی ہوتی ہے۔ وہی بچہ جو دوسروں کا کھلونا چھین لینا چاہتا ہے دراصل اتباع ہوی کرتا ہے اپنی بے علمی کی وجہ سے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اس سے چھیننے تو چلاتا ہے۔ آپ نے دیکھا؟ جس اصول کو وہ اپنے لیے درست سمجھتا ہے اسی کو دوسرے کے لیے فراموش کر دیتا ہے۔ جو دوسروں کے لیے روا تصور کرتا ہے اسے اپنے حق میں بھول جاتا ہے۔ اسی بھولی ہوئی فطرت کو قرآن یاد دلاتا ہے۔ یہی ہے وہ فطرتِ سلیمہ جو اتباعِ اہوا کی فطرتِ سقیمہ کے پردوں میں فراموش کردہ حقیقت کی طرح پوشیدہ رہتی ہے اور قرآن اسی کو "یاد دلاکر" سامنے لے آتا ہے۔

پس قرآن انسانی فطرت کا راہنما ہے اس لحاظ سے کہ وہ متضاد فطرتوں میں سے ایک کو عیاں کرتا ہے اور نیز مختلف فطرتوں کا صحیح مصرف اور ان کے درمیان متوازن امتزاج پیدا کرتا ہے۔

ایک حدیث

اسی فطرتِ سلیمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں بیدار فرماتے ہیں لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ کسی کا ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے ـــــ "بھائی" سے مراد اگر صرف "مسلمان بھائی" نہ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اس میں تمام انسانی برادری آجاتی ہے۔ کان الناس امۃ واحدۃ حضورؐ نے ایک ایسا مقیاس عطا فرمایا ہے جو عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ اس محک پر فطرتِ انسانی ـــــ فطرتِ سلیمہ ـــــ کی پرکھ اور راہنمائی بڑی خوبی سے ہو جاتی ہے۔ انسان دوسرے کی مرغوب شے کو بڑی حرص کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے اڑا لے جائے۔ لیکن اگر خود اس کی ویسی ہی مرغوب چیز کے ساتھ یہی ہو تو اس کی فطرتِ سلیمہ فطرتِ سقیمہ پر نوراً غالب آجاتی ہے۔ اس حدیث کی کسوٹی پر انسانی فطرت کو بڑی آسانی سے پرکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام کس لحاظ سے دینِ فطرت ہے۔ یہی ہے وہ کسوٹی جس سے عدل و اعتدال کی بقا ہے۔

محلِ استعمال یا مصرف

رہا محلِ استعمال تو فطرت کے اندر جو جذبہ بھی موجود ہے وہ استعمال ہی کے لیے ہے نہ کہ فنا کرنے کے لیے۔ جن صفات کو ہم صفاتِ رذیلہ عام طور پر کہتے ہیں ان کا بھی صحیح محلِ استعمال موجود ہے۔ غصہ ایک فطری جذبہ ہے مگر اس لیے کہ اپنے نفسِ امارہ پر اتارا جائے۔ حرص بھی فطری جذبہ ہے لیکن یہ محمود صفت ہے اگر حرص کا رخ خیر کی ہو۔ بخل فطری جذبہ ہے اور یہ بھی قابلِ تعریف ہے اگر اس کا دائرہ اپنی ذات تک محدود ہو۔ غرور فطرت میں ہے لیکن اس کا صحیح محل یہ ہے کہ ساری مخلوقات سے انسان کو برتر سمجھے۔ شہوتِ نفس فطری جذبہ ہے اور اس کا بھی ایک صحیح محل ہے اور وہ ہے اپنی رفیقۂ حیات۔ جنگ و قتال بھی فطری جذبہ ہے اور اس کے لیے صحیح محل اپنا نفسِ امارہ ہے یا ظالم حملہ آور خواہ انسان ہو یا درندہ ـــــ غرض ہر فطری جذبے کے لیے محلِ صحیح موجود ہے بشرطیکہ خود اس استعمال میں بھی غلو نہ ہو بلکہ اعتدال ہو ـــــ ہم نے جو مثالیں دی ہیں وہ اپنے اپنے محلِ استعمال میں محصور نہیں۔ ان مثالوں سے باہر بھی محلِ استعمال موجود ہیں نیز دوسرے رذائل کے لیے بھی محلِ استعمال موجود ہیں۔

اسی طرح صفاتِ محمودہ کے غلط استعمال سے وہ صفات غیر محمود ہو جاتی ہیں۔ رحم بڑی اچھی اور فطری صفت ہے لیکن اگر بچھو اور سانپ یا درندے کے ساتھ یہ سلوکِ رحم کیا جائے تو یہ محمود نہیں کہا جائے گا۔ سخاوت بڑی نیک صفت ہے لیکن اگر بے جا عیاشیوں کے لیے یہ سخاوت کی جائے

اور دوسرے مستحقین محروم ہو جائیں تو یہی صفت غیر محمود ہو جائے گی۔ غرض جس طرح صفاتِ محمودہ کے لیے غلط محل استعمال موجود ہیں اسی طرح صفاتِ رذیلہ کے لیے صحیح محل استعمال بھی موجود ہیں۔ فنا کسی جذبے کو بھی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی سمت صحیح کر دینی ہے۔

قرآن پاک نے فطری جذبات کو صحیح رخ پر لگانے کا اصول بھی بتایا ہے۔ مثلاً مسابقت و مقابلہ بھی ایک فطری جذبہ ہے اس کا صحیح محل یوں بتایا ہے فاستبقوا الخیرات نیکی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ اس ایک مثال سے دراصل ایک پورا اصول مستنبط ہو جاتا ہے دواعی فطرت کے صحیح استعمال کا۔

سمت صحیح کرنے کے بعد دوسرا کام قرآن مجید کا یہ ہے کہ وہ محلِ استعمال میں غلو سے بچاتا ہے یعنی جذباتِ فطرت کے استعمال کے لیے کچھ حدبندیاں قائم کرتا ہے لیکن یہ تحدید بھی عین فطرت انسانی ہے یہ چیز درحقیقت اعتدال میں داخل ہے اور ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اعتدال بھی فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ وہ اپنے تمام کاروبارِ حیات میں ہر موقعے پر آخر کار نقطۂ اعتدال ہی کو تلاش کرتا ہے۔ اگر کہیں بے اعتدالی پائی جاتی ہے تو اسے ہم غیر فطری جذبہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ فطرتِ سقیمہ کی کارفرمائیاں ہیں اور خود یہ بھی انسانی ہی فطرت ہے کہ فطرتِ سلیمہ کو فطرتِ سقیمہ پر ترجیح دے۔

خلاصہ

اب تک ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کا خلاصہ کریں تو یوں ہوگا:

(۱) فطر (ف، ط، ر) کا مادہ جس لفظ میں ہوگا اس میں اندر سے باہر پھوٹ پڑنے یا ظاہر ہونے کا مفہوم ہوگا۔

(۲) فطرت ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی شے کے اندر موجود ہوتی ہے اور وہ اپنے موقعے پر باہر آ جاتی ہے۔

(۳) ہر درجے کی مخلوقات کی فطرتیں الگ الگ ہیں اور بعض مشترک بھی ہیں۔

(۴) فاطر وہ ہے جو ساری کائنات کو پیدا کرنے والا بھی ہے اور ان کو خاص فطرتوں کا بخشنے والا بھی ہے۔

(۵) یہ فطرتیں کہیں غیر اختیاری ہیں (فطرتِ کونی) اور کہیں اختیاری۔ کہیں شعوری کہیں غیر شعوری۔ کہیں عقلی کہیں غیر عقلی۔

(۶) فاطر کی ایک اپنی فطرت بھی ہے جس کا کلی ادراک ناممکن ہے۔

(۷) اُس فطرتِ کلی کے جو مظاہر ہمیں کائنات میں نظر آتے ہیں وہ ہر شے کا صحیح محلِ استعمال اور مختلف اشیاء کے درمیان حکیمانہ امتزاج ہے۔

(۸) اپنی دیگر صفات کی طرح فاطر نے انسان کے اندر یہ فطرت بھی رکھی ہے یعنی صحیح استعمال و اعتدال (فطرتِ سلیمہ)۔

(۹) اس فطرت کے ساتھ اس میں غلط استعمال و عدم اعتدال کی فطرت بھی موجود ہے (فطرتِ سقیمہ)

(۱۰) فطرتِ سلیمہ ہر انسان میں موجود ہوتی ہے مگر فطرتِ سقیمہ (جس کا سبب بے عقلی و بے علمی وغیرہ ہوتا ہے) سے دبی بھی رہتی ہے۔

(۱۱) اسلام اسی فطرتِ سلیمہ کو ابھارتا ہے اور اسی لحاظ سے اسلام عین دینِ فطرت ہے۔

(۱۲) اسلام فطرتِ انسانی کو فطرتِ الٰہی سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے دوسرے لفظوں میں فطرتِ سلیمہ کی پرورش کرنا چاہتا ہے۔

(۱۳) اسی فطرتِ سلیمہ کی بیداری اخلاقی اقدار کی محافظ ہوتی ہے اور انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)